جناب ابوسلمان شاہجہانپوری

مولانا عبید اللہ سندھی کا ایک ترجمان

پروفیسر محمد سرور جامعی

(۴)

مولانا سندھیؒ سے تعارف

مولانا سندھیؒ سے سرور صاحب کی واقفیت اور تعلق حادثاتی نہیں ہے جیسا کہ اوپر کی سطروں سے شبہ ہو سکتا ہے۔ سرور صاحب نے ۱۹۲۰ء سے جو فکری سفر کیا ہے اس میں جو شخصیت سب سے نمایاں رہی ہے وہ مولانا سندھیؒ کی ہے۔ مولانا سندھیؒ کی عقیدت اور ان کی انقلابی شخصیت کا نقش ۱۹۲۰ء میں ان کے دل پر ثبت ہو گیا تھا۔ جب وہ آزاد مسلم ہائی اسکول گجرات میں زیر تعلیم تھے تو ان کے استادوں میں سے دو استاد بیک واسطہ مولانا سندھیؒ کے شاگرد تھے، یعنی مولانا نصر اللہ خان عزیز اور ملک حسن علی۔ ان دونوں بزرگوں نے خواجہ عبدالحی فاروقی سے قرآن حکیم کا درس لیا اور خواجہ صاحب نے مولانا سندھیؒ سے علوم و معارف قرآن حکیم میں استفادہ کیا تھا۔ اس لیے ان بزرگوں کی صحبتوں میں مولانا سندھیؒ کا نام اور ان کی شخصیت سرور صاحب کے لیے اجنبی نہ رہی تھی بلکہ مولانا سندھیؒ کے انقلابی افکار اسی زمانے میں ان کے ذہن پر مرتسم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پھر جب وہ جامعہ ملیہ گئے تو وہاں کی دینی انقلابی فضا میں مولانا سندھیؒ کی اولوالعزمیوں، ولولہ انگیزیوں اور جوش اسلامی کی گونج موجود تھی۔ ان حالات میں ممکن نہ تھا کہ سرور صاحب اپنے ذہن اور دماغ کے دریچوں کو باہر کی

ہوا آنے سے بند کر لیتے۔ اس زمانے میں سرور صاحب کا جتنے اکابر سے بھی تعارف ہوا وہ تمام مولانا سندھی کے شناسا اور ان کے منصوبے کے ہمراز و آشنا تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب سرور صاحب مصر گئے تو وہاں بھی مولانا سندھی کے نام کی شہرت سنی اور عجیب طریقے سے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

> "جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی سے فارغ ہونے کے بعد مصر جانے کا موقع ملا۔ جامعہ ازہر میں داخلہ لیا اور ایسے ہوسٹل میں جگہ ملی جہاں انڈونیشی طلبہ تھے۔ یہ طالب علم اکثر وطن سے پہلے حجاز آتے اور پھر ازہر کا قصد کرتے۔ ایک دفعہ ایک انڈونیشی طالب علم قاہرہ پہنچے، ان کے بارے میں انڈونیشی طلبہ میں بڑے زوروں سے یہ چرچا کیا گیا کہ اس نے مکہ میں کسی "شیخ ہندی" سے پڑھا ہے اور وہ عجیب عجیب باتیں کرتا ہے ایک بات جو اس کے متعلق بڑی مشہور ہوئی وہ یہ تھی کہ ہمارے شیخ نے کہا ہے کہ صحیح بخاری حدیث کی اصح الکتب نہیں بلکہ اصح الکتب امام مالک کی موطا ہے۔ اس انڈونیشی طالب علم نے مکہ میں مولانا سندھی سے استفادہ کیا تھا۔"[1]

مصر سے واپسی کے بعد زمیندار لاہور سے وابستگی کے زمانے میں اور پھر جامعہ ملیہ کی پروفیسری کے زمانے میں جس نے گردو پیش میں انہوں نے زندگی گزاری تھی اس میں کوئی شخص مولانا سندھی کی شخصیت سے ناواقف نہیں رہ سکتا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں تقریباً پورے ملک کے حریت پرست اخباروں، جماعتوں اور رہنماؤں نے ان کی جلاوطنی کے خاتمے کے لئے تحریک شروع کر دی تھی، یہ سرور صاحب کے سامنے کی بات تھی۔

مولانا سندھی کی خدمت میں حاضری:

سرور صاحب جنوری ۱۹۳۹ء میں مولانا سندھی مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو مولانا کی

---

[1] افادات و ملفوظات، ص ۲۰

انقلابی شخصیت اور ملک کی آزادی کے لیے ان کی خدمات سے پوری طرح باخبر بھی تھے اور اردو، انگریزی، عربی زبانوں اور مختلف سیاسی جماعتوں اور افراد کی خدمات سے آگاہی، غرض کہ علم و مطالعہ اور فکر و نظر کی دولتوں سے آراستہ ہوکر مگر طالب علمانہ جذبے کے تحت پہنچے تھے۔ لیکن ان کے علم و مطالعہ اور فکر و نظر کی حیثیت مولانا سندھی مرحوم جیسی شخصیت کے سامنے کیا تھی جو گزشتہ ۲۳، ۲۴ برس سے ملک سے دور تھی۔ جس کا نہ ملک کی سیاسیات سے براہ راست تعلق تھا، نہ معلومات کے اس کے پاس آج کل جیسے بہترین ذرائع تھے۔ اس کی روداد سرور صاحب ہی کی زبانی سنیے، لکھتے ہیں :-

"میں جب مکہ معظمہ میں مولانا سندھی کی خدمت میں پہنچا تو تھوڑا بہت پڑھا تھا۔ میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بی اے آنرز (عربی) کی تھی اور کوئی ساڑھے تین سال قاہرہ میں جامعہ ازہر میں پڑھا تھا۔ ایک سال میں جامعہ مصریہ قاہرہ میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین، احمد امین اور بعض دوسرے اساتذہ کے محاضرات (لیکچرز) میں بیٹھا تھا۔ واپسی پر تقریباً چار سال تک جامعہ میں پڑھا چکا تھا۔ تھوڑا بہت عام مطالعہ بھی تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ جامعہ کا علمی ماحول میسر تھا جہاں بڑے بڑے علماء و فضلا موجود تھے، جن سے استفادہ کا پورا موقع ملا تھا۔ اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ جب میں مولانا کی خدمت میں ان کے گھر پر حاضر ہوتا۔ وہ گفتگو شروع کرتے اور بعض دفعہ مسلسل کئی کئی گھنٹے بولتے رہتے تو میری یہ حالت ہو جاتی کہ جیسے جو کچھ پہلے پڑھا تھا۔ وہ ذہن سے دھل گیا ہے اور یہ جو اب سن رہا ہوں، اس کا کچھ اتا پتا نہیں چلتا۔ ہندوستان کی سیاسیات پر باتیں کرتے۔ عربوں اور ترکوں کا ذکر تک آتا۔ اسلام کی تاریخ کا جائزہ لیا جاتا۔ قرآن کے بعض نکات ارشاد فرماتے۔ روایات پر جرح ہوتی قدیم معتقدات پر تنقید کرتے۔ غرض تو یہ تو افکار و خیالات کا ایک

سیلاب تھا، جو مضبوط بند توڑ کر بڑی بڑی سیاسی و دینی شخصیات، صدیوں کے مروجہ عقائد و روایات اور تاریخی عقیدتوں اور نظریات کو اپنے زبردست دھارے میں بہائے لئے جاتا محسوس تک ہوتا۔ اس دوران میں میں بہت کم بولتا بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ مجھے یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ جب مولانا اس عالم جذب میں گفتگو فرما رہے ہوں تو میں ان کے سامنے زبان کھول سکوں۔ ایک دماغ جس میں اسلام کا سارا نقلی و عقلی سرمایہ علم ہو اور اس میں برسوں کے بڑے بڑے عملی و سیاسی سنگین اور تلخ تجربے بھی شامل ہوں۔ ایک دل جو ماضی اور حال کے شدید صدموں سے دکھی ہو۔ آنکھیں جو آنے والے دور کی ہولناکیاں دیکھ رہی ہوں یہ احساس کہ کسی کو ان خطرات کی فکر نہیں اور سب وقتی اور غیر اہم باتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ایک عام مایوسی اور اس پر قدرتاً انتہائی برہمی اور ساتھ ہی یہ جذبہ کہ اگر میری باتیں سُن لی جائیں اور مجھے کام کا موقع ملے تو میں کشتی کو منجدھار سے نکال کر سلامتی کے ساحل کی طرف لے جا سکتا ہوں۔ ایک طرف اپنے اوپر یقین اور دوسری طرف گرد و پیش کے اتنے مایوس کن حالات اور ان میں اپنے لئے کہیں سے بھی سازگاری کی کوئی امید کی کرن نظر نہیں آرہی۔ مختصراً یہ کیفیت ہوتی تھی مولانا کی جب وہ کبھی کبھی مجھ سے کئی کئی گھنٹے خطاب فرماتے۔ میں دم بخود ہوتا اور وہ بولتے جاتے۔ ان کے الفاظ انگارے سے ہوتے۔ ان کے افکار میرے ذہن و قلب کے پہلے کے بنے ہوئے، بتوں کو مسمار کرتے جاتے، شخصی بتوں اور اعتقادی بتوں کو بلکہ ان فکری ضربوں سے خود میری اپنی شخصیت بھی جو اتنے برسوں کی جانکاہی اور کئی عوامل و محرکات سے بھلی بری بنی تھی، ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔

سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی کی خدمت میں میری حاضری پہلے پہل تو میرے لئے تخریب ہی کی حامل ہی۔ پہلے کے نقش اور تاثرات ذہن و قلب سے مٹے زیادہ اور نئے بنے کم۔ اور دوسرے الفاظ میں یہ "لا" کا عمل تھا تاکہ "الا" کی راہ صاف ہو سکے۔[1]

مولانا سندھی سے استفادہ

ہندوستان واپس آنے کے بعد بھی مولانا سندھی مرحوم سے استفادے کا سلسلہ جاری رہا۔ معمول یہ تھا کہ سرور صاحب کو جب کبھی مولانا کی خدمت میں بار ملتا۔ مولانا مذہب، سیاست، تاریخ، تصوف وغیرہ کا کوئی موضوع انتخاب فرما لیتے اور اس پر گفتگو شروع کر دیتے سرور صاحب چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے۔ کبھی کوئی بات واضح نہ ہوتی یا ان کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ مولانا سے پوچھ لیتے۔ مولانا نہایت شرح و بسط سے اس کا جواب دیتے اور ایک ایک نقطے کی پوری وضاحت فرماتے۔ بعض دفعہ یہ صحبت تمام تمام دن جاری رہتی بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ مولانا نماز صبح کے بعد جو بیٹھے تو سارا دن تعلیم و ارشاد فرمانے گزار دیا۔ مجلس ختم ہوتی تو سرور صاحب مکان پر پہونچ کر مولانا کے ان ارشادات کو اپنی یادداشت سے قلمبند کر لیتے۔ سرور صاحب کا بیان ہے کہ :

"مولانا کے حضور میں کچھ لکھنا ممکن نہ تھا۔ ایک دو دفعہ میں نے کوشش بھی کی لیکن ایک تو اس طرح لکھنے سے مولانا کے انہماک اور یکسوئی میں خلل آتا اور دوسرے گفتگو اتنی موثر اور دل و دماغ کو مسحور کرنے والی ہوتی کہ ذہنی تاثرات کو اسی وقت قید تحریر میں میرے لئے مشکل ہو جاتا۔ ناچار مجھے اپنے حافظے ہی پر انحصار کرنا پڑا"

یہ بات سرور صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم پر اپنی پہلی کتاب کے پیش لفظ میں لکھی ہے۔ یہ کتاب مولانا کے "حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار" میں ہے مولانا سندھی مرحوم

---

[1] سرور "افادات و ملفوظات" محولہ بالا : ص ۳۴ - ۳۵

کی زندگی ہی میں اکتوبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی مولانا مرحوم نے اسے پسند فرمایا تھا۔ چونکہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سرور صاحب کے بارے میں مولانا سندھی مرحوم کی رائے بہت اچھی ہوگئی اور انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ان میں نہ صرف ان کی باتوں کو سمجھنے کی استعداد ہے بلکہ وہ ان کی ترتیب اور پیش کش کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔

افادات و ملفوظات :

اس کے بعد مولانا سندھی ان سے نازک سے نازک مسئلے پر اور کھل کر باتیں کرنے لگے۔ اور سرور صاحب حسب دستور سابق ان گفتگوؤں اور باتوں کو مرتب کرتے رہے تاآنکہ مولانا کی زندگی ہی میں مختلف موضوعات، سیاست، مذہب، تصوف، تاریخ اور بعض ان کی معاصر شخصیات اور بعض اسلاف کے بارے میں ملفوظات، افکار ان کے تاثرات اور مطالعہ و مشاہدہ کا اتنا ذخیرہ ہوگیا کہ $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ سائز پر ۵۱۲ صفحے کی ایک عظیم الشان تصنیف ہمارے سامنے ہے۔

سرور صاحب لکھتے ہیں :

> "اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد مولانا مجھ پر اور شفقت فرمانے لگے۔ وہ دلسوزی سے پڑھاتے، گفتگو کرتے تو گھنٹوں کرتے رہتے نازک سے نازک مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ کبھی کوئی خاص بات کہتے تو فرما دیتے کہ اسے اس وقت شائع کرنا جب تم فضا سازگار پاؤ۔ مولانا کے یہ ارشادات راقم الحروف یادداشتوں کی شکل میں قلم بند کرتا جاتا تھا۔ اگست ۱۹۴۴ء میں مولانا نے وفات پائی۔ آخری دنوں میں میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور وعدہ کیا کہ آپ کے تازہ ارشادات پر مشتمل ایک دوسری کتاب جلد ہی مرتب ہو جائیگی لیکن بدقسمتی سے وہ ان اٹھائیس سالوں میں مرتب نہ ہوسکی۔ اس طویل مدت میں اپنے محترم بزرگ سے کیا ہوا یہ وعدہ مجھے برابر یاد رہا۔ کئی دفعہ میں نے ان یادداشتوں کو نکالا، پڑھا اور انہیں مرتب کرنے

ارادہ کیا لیکن وہ چیز جسے باطنی تحریک کہتے ہیں اور جو کسی کام کو کرنے
پر اس طرح ابھارتی ہے کہ آدمی کو اسے کئے بغیر بن نہیں پڑتا، وہ میسر
نہ ہوئی اور یہ کام شروع نہ کیا جا سکا[1]۔

اس کے بعد سرور صاحب نے ۱۹۴۴ء کے بعد سے لے کر ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں پہلے عام انتخابات تک کے حالات اور ملک میں اسلام پسندوں کی پیدا کی ہوئی فضا اور اسکے نتائج پر توجہ دلائی ہے اور مولانا سندھی مرحوم کے افادات و افکار کے مطالعے کی ضرورت اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ان سے رہنمائی کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

ایک سچا انقلابی

مولانا عبیداللہ سندھی حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ مذہبی عقائد میں ان کا مسلک وہی تھا جو علمائے دیوبند کا ہے اگر انہیں کسی جماعت سے وابستہ کیا جانا ضروری ہو تو وہ دیوبندی ہیں لیکن وہ چونکہ جمود کے سخت ترین مخالف ہیں اور کسی جماعت کو تقدس کا درجہ دینا نہیں چاہتے نیز اس وجہ سے کہ وہ ایک مفکر اور انقلابی ہیں اس لئے وہ کسی فکر یا کسی جماعت کے مقلد اعمیٰ نہیں بن سکے اس لئے وہ دیوبندی جماعت کو بھی مطمئن نہیں کر سکتے اور انہیں اس کی کوئی پروا بھی نہیں اور ایسی صورت میں کہ وہ دیوبندی جماعت کی بھی پروا نہیں کرتے تو کسی دوسری جماعت کی کیونکر پروا کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے کوئی خوش نہیں لیکن وہ چونکہ کسی ایک جماعت کے نقطۂ نظر کو پوری طرح اپناتے نہیں ہیں اسی طرح ان کا جماعتی تعصب کلیتاً کسی جماعت کا اصل و فرع اور اصول و نظام میں رد بھی نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کو ان سے جہاں شدید اختلاف پیدا ہوتے ہیں وہیں ان کے افکار و ملفوظات میں ان کی دلچسپی کی باتیں بھی بہت سی مل جاتی ہیں۔ مثلاً مولانا سندھی قرآن مجید کے تعزیراتی احکام جیسے قطع ید وغیرہ اور حدیث میں جو رجم زانی اور زانیہ کو سنگسار کرنے کی سزا مروی ہے یا حدیث و سنت میں بعض انتظامی معاشرتی

---

[1] افادات و ملفوظات، ص ۱۷

اور معاشی امور مثلاً زکوٰۃ کی شرح کی جس طرح تعین اور تحدید کی گئی ہے انہیں ابدی اور غیر مبدل نہیں مانتے ، زمانہ حال کے متجددین اسلام اس سے بہت خوش ہوں گے لیکن بعض جماعتوں کی اسلام پسندی اور اس کے مضمرات کے بارے میں ان کے خیالات پڑھیں گے اور اندازہ کریں گے کہ یہ ایک صحیفہ افادات وملفوظات ان کے افکار اور فلسفے کے قتہ کسر دی کے لئے وہ ضرب اسلامی ہے جس کے لئے ان کے پاس کوئی ڈھال نہیں تو وہ حسب سابق ان کے خلاف اشتعال انگیز مضمون لکھیں گے اور انہیں کافر، فاسق اور ملحد و بے دین ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور زمانہ حال کی اصطلاحوں میں کانگریسی ، ہندو کا ایجنٹ، پاکستان کا دشمن ، نظریہ پاکستان کا مخالف ، کمیونسٹ ، اشتراکیت نواز ، طاغوت کا معاون وغیرہ کے خطابات سے نوازا جائے گا ۔

اسی طرح جب سیکولرازم ، سوشلزم کے حامی مولانا کے سیاسی ، معاشرتی ، معاشی افکار کا مطالعہ کریں گے تو بہت خوش ہونگے لیکن جب انہیں معلوم ہوگا کہ مولانا اپنے تمام ترقی پسندانہ خیالات کے باوجود " زندگی سے متعلق کسی بھی لائحہ عمل کا مذہب کے بغیر تصور ہی نہیں کرسکتے تھے " تو ان کے لئے مولانا کی حقیقت پسندی کا اعتراف تو درکنار ان کے لئے مولانا ایک ناقابل برداشت شخصیت ہوں گے ۔ وہ مولانا کی اس مذہبی فکر کو اپنے اشتراکی نظام کے لئے سخت خطرناک اور اس کتاب کا مطالعہ ممنوع قرار دیں گے ۔

حقیقت پسند مسلمان

مولانا سندھی مرحوم نے سیاسی ، سماجی اور معاشی نظریات پر بحث کرتے ہوئے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کردینا چاہیے کہ " مولانا سندھی ایک مذہبی آدمی تھے اور وہ زندگی سے متعلق کسی بھی لائحہ عمل کا مذہب کے بغیر تصور ہی نہیں کرسکتے تھے " لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ سیاسی اور سماجی معاملوں میں خواہ مخواہ مذہب کو استعمال کیا جائے اور لوگوں کے جذبات کو مشتعل کیا جائے ۔ ان کے خیال میں سیاسی و سماجی مسائل کے حل کے لئے جس نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ مذہبی جذباتیت میں نہیں بن سکتا ۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو مذہبی جذبات ذہن وعقل پر غالب آجاتے ہیں اور محض

جذبات ہمیں کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتے یا سیاسی و سماجی مسائل میں مذہب کا تقدس باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ پاکستان کے پچھلے انتخابات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام پسند تحریک کے رہنماؤں نے محض انتخاب جیتنے کے لئے بعض پارٹیوں سے مقابلے کو نہایت زور و شور کے ساتھ اسلام اور کفر کی جنگ قرار دیا۔ وہ اپنے جوش مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ جمعیت علمائے اسلام کے متعدد رہنماؤں کے خلاف بھی اشتراکیت اور سوشلزم نوازی کے الزام میں دائرہ اسلام سے اخراج کا فتویٰ دیا اور جمعیت کے جن رہنماؤں کے خلاف سوشلزم نوازی میں کفر کا فتویٰ دیا تھا، جب ان کے اسلام کے خلاف اسی سوشلزم نواز جماعت کا ایک عالم دین جیت گیا تو اسی اخبار نے اس رہنما کی پورے صفحے کی تصویر چھاپی جس کے نیچے علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر درج کر کے اس کے کمال عزیمت دعوت اور رسوخ ایمانی کی داد دی:

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

تحریک پاکستان کے زمانے میں جس طرح مذہب کے نام کو استعمال کیا گیا تھا اور کامیابی حاصل کی تھی، اسلام پسندوں نے وہی حربہ آج استعمال کرنا چاہا اور اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ اس وقت مقابلہ ہندوؤں سے تھا آج مقابل مسلمان ہیں اس لئے جو ہتھیار اس وقت کارگر ہو سکتا تھا، آج کے دور میں اور خصوصاً مسلمانوں ہی کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ سرور صاحب ۱۹۴۶ء کی سیاسی فضا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا سندھی اس طرح کی، مذہبی سیاست کے سخت مخالف تھے ان کا بنیادی فکر یہ تھا کہ یہ دور ملک و وطن پر قائم قومی، جمہوری اور سیکولر حکومتوں کا ہے اور ایسی حکومتیں اس زمانے میں اسلام کی حقیقی روح اور اس کے عوامی و عالمگیر اصولوں کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ عوام کی سیاسی جدوجہد کو فرقہ وارانہ مذہب کے بجائے قومی و معاشی آزادی کی بنیادوں پر چلانے دعوت دیتے تھے"[۲]

آگے چل کر سردر صاحب نے مولانا کے خیالات کی ان الفاظ میں ترجمانی کی ہے :-

"مولانا فرمایا کرتے تھے کہ جس صنعتی دور میں ہم داخل ہو رہے ہیں، اس سے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اس میں آگے جائیں گے اور آگے جائیں گے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اب اگر آپ اس آنے والے صنعتی دور میں اپنی زندگی سے اسلام کو خارج کرنا چاہتے اور اس کی روحانی و اخلاقی قدروں اور تاریخی و اجتماعی تسلسل کو ضروری سمجھتے ہیں، تو اس فکر کو مشعلِ راہ بنائیے۔ یہ فکر میرا نہیں، میرا ایجاد کردہ نہیں، یہ دراصل شاہ ولی اللہ صاحب کا فکر ہے جس کی میں نے آج کے دور کے لئے نئی تعمیر کی ہے۔ مولانا سندھی کو اس پر اصرار تھا اور وہ ہمیشہ اس نام سے اپنے اس فکر کا تعارف کراتے تھے وہ اس سلسلے میں شاہ صاحب کی کتابوں کے حوالے دیتے اور اپنے ہر بنیادی خیال کی اصل کی ان کی تعلیمات میں نشاندہی کرتے۔ مولانا نے سالہا سال شاہ صاحب کی کتابوں کا غائر مطالعہ کیا تھا اور ولی اللہی فکر کی توضیح و ترتیب اور تلخیص و تنقید میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ میرے اس فکر کی تاریخ ہے اور اس تاریخ کے سرے بہت دور ماضی میں جاتے ہیں اس لئے آج کے اسلامی ذہن کو اسے قبول کرنے میں جھجک نہیں ہونی چاہئے"۔[۱]

مولانا سندھیؒ اور یورپین ازم

مولانا سندھیؒ یورپین ازم کے بہت دلدادہ ہی نہیں اس کے داعی بھی ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کے دو درجے ہیں :

---

[۱] "افادات و ملفوظات" ص ۱۶

۱۔ سائنسی اور ٹیکنالوجی میں اہل یورپ کی ترقی کو نمونہ بنانا اور اس سے فائدہ اٹھانا۔ اور

۲۔ ان کے طرز بود و ماند، وضع و لباس اور طعام کے طور طریقوں کو اختیار کرنا۔

جہاں تک پہلے درجے کا تعلق ہے تو بلا شبہ ہمیں ان کی ترقی سے سبق سیکھنا چاہیے، اور جب تک ہم خود سائنسی ایجاد کے قابل اور ٹکنالوجی میں ماہر نہیں ہو جاتے، ہمیں بے جھجک ان کی تحقیقات، ان کی ایجادات اور ان کی مہارت فنی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اپنا نقصان کرتے ہیں۔

دوسرے درجے میں بھی جہاں تک مولانا سندھی مرحوم کے اخلاص کا تعلق ہے اس سے تو انکار نہیں لیکن ان باتوں کو اختیار کرنے میں مولانا کے اصرار کی افادیت میں ہمیں شبہ ہے۔ ہمارے خیال میں یہ چیز زائد ہے۔ اس باب میں مولانا کے تشدد کو ہم انتہا پسندی کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتے۔ درحقیقت یہ ہمارا مسئلہ ہے ہی نہیں۔ یہ بات ہم نہ مذہبی تقشف کی بنا پر کہہ رہے ہیں نہ تو ہمیں یوروپین لباس اور مغربی آداب طعام کے جواز و عدم جواز کے نقطۂ نظر سے مولانا مرحوم کی رائے سے اختلاف ہے۔ ایک ادیب کسی معاشرتی و سماجی یا تہذیبی مسئلے پر اس حیثیت سے نظر ڈالتا ہی نہیں۔ مولانا کی اس رائے سے اختلاف کے باوجود۔ ان کے یہ بات کہنے کے استحقاق سے بھی انکار نہیں کرتے۔ یہ بات کہنے کے لیے ان کے پاس جواز بھی ہے۔ ہماری رائے میں مولانا ایک انقلابی ہیں۔ ایک انقلابی کے لیے فکر و رائے میں متشدد اور کسی حد تک انتہا پسند ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مولانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کسی طرح روایت پرستی کے حصار سے نکلیں اور ان کی زندگی کا جمود ٹوٹے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کریں جس سے مسلمانوں میں زندگی کی حرکت پیدا ہو۔ اس کے لیے مولانا ان کے احساسات کو جھنجھوڑتے ہیں اور جذبات کو اشتعال میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اصل مسئلہ ہیٹ لگا لینے، یا پتلون اور تسموں والے جوتے پہننے کا نہیں ہے لیکن اگر وہ اس سے زیادہ کے متمنی نہ ہوں تو کم سے کم جو دراصل مطلوب و مقصود ہے وہ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے دونوں سطحوں پر یوروپین ازم کو اپنانے کی دعوت کا مقصد مسلمانوں کو جھنجھوڑنا اور بیدار کرنا ہے۔ یہ پہلو بھی نظر میں رہنا چاہیے کہ اس وقت کے اسلامی ہند اور افغانستان کی قدامت پرستی کے خلاف درحقیقت یہ مولانا سندھی کا شدید رد عمل تھا۔

(مسلسل)